کریملن جمہوریتوں کے بہت سے معاملات میں کوئی اقتدار اور اختیار نہیں رکھتے۔ انہیں اگر کوئی اختیار تھا بھی تو وہ اسے برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ جہاں بہت سے لوگوں کو تشویش ہے کہ کسی اقتدار کے بغیر ملک مفلوج ہوکر رہ گیا ہے، اس کے ساتھ جناب گورباچوف متعدد بار اپنے لیے اضافی اختیارات حاصل کر چکے ہیں۔ کئی مبصّرین کا خیال ہے کہ اس سے جناب گورباچوف کے پاس سٹالن اور برزنیف سے کہیں زیادہ اختیارات آگئے ہیں۔ اور ایک نئی قسم کی کمیونسٹ ڈکٹیٹرشپ جنم لے چکی ہے۔

مایوسی کی بات یہ ہے کہ جناب گورباچوف ملک کی بیمار معیشت کی اصلاح کے لیے اپنے اختیارت کو مناسب طریقے سے استعمال نہیں کرسکے۔ اس کی بجائے انہوں نے بیرون ملک بھیک مانگنا شروع کردی۔ کانگریس کے ایک رکن امالاٹوف کی طرح بہت سے دوسرے لوگ اسے باعثِ رسوائی خیال کرتے ہیں کہ عالمی طاقت ہونے کا دعویدار ملک دوسرے ملکوں سے امداد حاصل کرنے کی تگ و دو کرے۔

اقتصادی میدان میں ناکامی اور کئی دیگر غیر تسلّی بخش پالیسیوں کے باعث پارلیمنٹ میں جناب گورباچوف کی مخالفت میں اضافہ ہوا ہے، جسے کم کرنے کے لیے وہ حکومت میں کئی تبدیلیاں لانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں قدامت پسندوں اور آزاد خیالوں کے درمیان جنگ ٹھن گئی ہے۔ بہت سے مبصّرین کے خیال میں اس طرح جناب گورباچوف نے اپنی رخصتی کا خود ہی بندوبست کر لیا ہے۔ کیونکہ جو صدارتی اختیارات وہ سنبھالے ہوئے ہیں، ان کے لیے ریفرنڈم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

یہ صرف معیشت ہی نہیں ہے جس نے ملک کو تباہی کے دھانے پر پہنچا دیا ہے بلکہ امن و امان، سیاسی نظام، تاریخ و ثقافت، سماجی، اخلاقی اور روحانی سوالات ان مسائل میں سے چند ایک ہیں جن کا جامع اور غور و فکر پر مبنی حل تلاش کرنا ابھی باقی ہے۔ نسلوں پرانے ابتر تعلیمی معیار، ناقص طبّی سہولتوں، خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ، بچوں کا استحصال، روز افزوں جرائم، سن رسیدہ لوگوں سے لاپرواہی، ماحولیاتی آلودگی اور متعدد دیگر مسائل کا حل تلاش کیا جانا ایک ایسے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے بے حد ضروری ہے جس میں قانونی اداروں کے تحت قوانین و ضوابط کا احترام کیا جائے۔

روسی معاشرے کے لیے جس پیمانے پر اصلاحات کی ضرورت ہے ، اس کا پوری طرح ادراک نہیں کیا گیا۔ جمہوریت اور آزادی کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ عوام میں کس حد تکOpennessراہ پاتی ہے۔

جمہوری دور میں اسلام

سوویت علمی حلقوں میں مذہب مخالف پراپیگنڈے کے لگے بندھے انداز کا از سر نو جائزہ لیا جا رہا ہے۔ مسلم تہذیب کی طویل تاریخ، بالخصوص وسطی ایشیا میں، اپنی گواہ آپ ہے۔ دہریت ناکام ہو چکی ہے۔

مذہب پر کسی حملے کی اب حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی اور نہ اس طرز عمل کی کامیابی کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کے بجائے سرکاری حکام نہایت محتاط اور ڈھکے چھپے طریقے سے مذہبی حلقوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ اس سے موجودہ حکومت کے لیے نقصان دہ رجحانات میں اضافہ نہ ہو۔ سوویت یونین کی کونسل برائے مذہبی امور کے وائس چیئرمین جناب کے۔ مولادوبیف نے زور دے کر ان سہولتوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جو حال ہی میں مسلمانوں کو فراہم کی گئی ہیں۔ (دیکھیے: پراودا ووستوکا، 8 جنوری 1991ء) مساجد کی تعداد میں اضافے، جن کی موجودہ تعداد 1150 ہے، اور قرآن پاک کے مختلف زبانوں میں تراجم کی تیاری کے علاوہ انہوں نے جمہوری آزادی کا ذکر کیا ہے جس کے تحت اب حکومت سے وابستہ مسلم علماء سوویت پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جو بات اس جمہوری عمل کے برعکس دکھائی دیتی ہے وہ اسلامی احیاء کا مقصد رکھنے والی پارٹی کی تشکیل کے خلاف سرکاری ذرائع ابلاغ کا مسلسل پراپیگنڈہ ہے۔ تازہ ترین تنقید پراودا ووستوکا (یکم فروری 1991ء) میں سامنے آئی۔ جس میں مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ انہیں اپنی پارٹی تشکیل دینے یا کسی دوسری سیاسی تنظیم کے ساتھ وابستگی سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اور مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے جو کچھ فراہم کیا جا رہا ہے، انہیں اس پر مطمئن ہو جانا چاہیے۔ روزنامہ کوئی شواہد مہیا کیے بغیر اخوان المسلمون پر مسلم دنیا میں کشیدگی پھیلانے کا الزام عائد کرتا ہے۔ وہ اسلامک پارٹی (Islamic Party) کو اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے وہ سوویٹ یونین میں مذہبی حکومت کے قیام کا ارادہ رکھتی ہے۔

اسلامک پارٹی کو سوویٹ یونین کے نئے مذہبی قانون کے لیے ایک خطرہ محسوس کیا گیا ہے اور سرکاری مذہبی رہنما بھی اسلامک پارٹی کے خلاف اسی طرح آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ وسطی ایشیا اور قزاقستان کے مذہبی بورڈ کے چیئرمین مفتی صادق محمد یوسف نے پارٹی کو غیر

منطقی اور لغو قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں اسلام بذات خود ایک پارٹی ہے اور قرآن اس کا آئین ہے۔

ازبکستان میں اندازحان سٹیٹ انسٹی ٹیوٹ برائے فنِ تعلیم (Andizhan State Padagogy Institute) کے پروریکٹو ویلیف کا کہنا ہے کہ پرسٹرائیکا کا اثر و نفوذ مذہب سمیت تمام شعبہ ہائے زندگی میں ابھی تک پوری طرح نہیں پہنچا۔ (کمیونسٹ ازبکستانا - نمبر10، 1990ء) اور یہ معاشرے کو جمہوریت میں ڈھالنے کے عمل کا حصّہ ہے۔ وہ 1989ء میں مفتی شمس الدین کی برخواستگی کے مطالبے کو مجموعی صورت حال سے الگ معاملہ قرار نہیں دیتے۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں اپنے مذہبی رہنما منتخب کرنے کا حق ہونا چاہیے اور حکام وقت ان کے مذہبی رہنما نامزد نہ کریں۔ جناب ویلیف کے خیال میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جو بھرپور توجہ کے مستحق ہیں۔

ان میں سب سے پہلا اور اہم سوال کمیونسٹ حکمرانوں کے دور استبداد میں پیش کردہ اسلام کا منفی امیج (image) ہے۔ مسلمانوں کو باہم منقسم گروہ کی حیثیت سے پیش کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی رہی کہ وہ وہابی ہیں یا ایسے ہی انتہا پسند گروہوں سے متعلق ہیں۔ جناب ویلیف کا مشورہ یہ ہے کہ جب تک مسلم اور ان کی مساجد اس بحرانی دور میں اپنی برادری کے لیے مثبت سماجی کام سرانجام دے رہی ہیں، حکمران جماعت کو ان کی آزادی میں مداخلت سے باز رہنا چاہیے۔

ایک اور سوویت سکالر جناب ایس-ایل- لگائے مذہبی روایات کے بارے میں اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ حالیہ وسیع تبدیلیوں اور سیاسی آزادی کے باوجود مثبت و ترقی پسند اور منفی روایات میں فرق کیا جانا چاہیے۔

ان دنوں جب کہ اشتراکی نظام ایک بہت ہی مشکل مرحلے سے گزر رہا ہے، ان کے بقول سیاسی تبدیلی کی لہر کی موجودگی میں مذہبی روایات پر عمل کرنے کی آزادی ملک کے لیے قطعی نقصان دہ ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ عوامی سطح پر مذہبی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے جب کہ سرکاری سطح پر صورت حال جوں کی توں برقرار ہے۔